رجسٹرڈ ایل ۹۲۲
دن نمبر ۲۹

تار کا پتہ
"انجمن علی گڑھ"

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے
سالانہ چندہ دو روپے

جلد ۱۲ | ۱۵ دسمبر ۱۹۵۴ء | ایڈیٹر۔ قاضی عبدالغفار | ۱۸ ربیع الثانی | نمبر ۴۸

ریاستی شاخ کی تشکیل

ہم بتا چکے ہیں کہ اتر پردیش کی مجوزہ ریاستی شاخ کی تشکیل کے متعلق مرکزی دفتر کو الزام دینا محض غلط ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس عرصے میں طلبا کے داخلوں کا کام اس منظم طریقے سے نہ ہو سکا جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، لیکن عجیب بات ہے کہ اس کی شکایت ایسے اصحاب بھی کرتے ہیں جنھوں نے اپنے مقام پر دس بیس طلبا کو بھی امتحان میں داخل کرانے کی کوشش نہیں کی۔ جن مقامی شاخوں نے یا مقامی کارکنوں نے اس طرف توجہ کی انھوں نے اپنے اپنے مقام پر بہت کچھ کرلیا، لیکن ایسے دوستوں کی زبان سے یہ شکایت اچھی نہیں معلوم ہوتی جو اتنا بھی نہ کرسکے۔ یہ احباب وہ ہیں جو خود تو کوئی کام کرتے نہیں اور عموماً مرکزی دفتر پر اعتراض کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ ان سے مخاطب ہونا ہی فضول ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض اضلاع اور شہروں میں صوبائی تنظیم کے بغیر بھی مقامی طور پر وہاں کے کارکنوں نے بہت کام کرلیا اور ریاستی شاخ کے بغیر بھی وہ موثر جدوجہد کرسکے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ صوبائی تنظیم کی عدم تکمیل کی شکایت درحقیقت محض برسبیل شکایت ہے اور کام نہ کرنے کا ایک پردہ ہے۔

جہاں تک صوبائی کمیٹی کی تنظیم کا تعلق ہے ہم بتا چکے ہیں کہ انجمن کی مجلس عاملہ نے کبھی بھی اس کام میں تساہل نہیں کیا لیکن جو دشواریاں پیدا ہوئیں ان کے رفع کرنے میں کچھ تو وقت صرف ہوتا۔ اول تو شاخوں کے قواعد کی ترمیم میں شاخوں سے مشورہ کرنے میں بہت وقت صرف ہوا۔ اور جب وہ کام ختم ہوا اور معاملہ مجلس عاملہ کے سامنے آیا تو بعض اراکین نے اس بات پر زور دیا کہ ایک سب کمیٹی قواعد پر نظر ثانی کرنے کے لئے بنائی جائے۔ جب اس کمیٹی نے از سر نو قواعد مرتب کئے تو یہ تجویز پیش ہوئی کہ صوبائی کمیٹی میں تمام شاخوں کو نمائندگی دی جائے چنانچہ مجلس عاملہ کے اس فیصلے کی بنا پر شاخوں کے نمائندوں کی تعداد کا حسب قواعد تعین کرکے ان کو دعوت دی گئی کہ وہ اپنے نمائندے منتخب کریں۔ اس کام میں بھی شاخوں نے بہت تساہل کیا اور باوجود یاد دہانیوں کے دو تین مہینوں میں بالآخر شاخوں کے نمائندوں کے نام وصول ہوئے اور اب صرف اتنا ہی کام باقی ہے کہ یہ نمائندے صوبائی کمیٹی

کے عہدے داروں کا انتخاب کریں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ انجمن کے کسی رکن نے بھی اس کام میں کوئی رکاوٹ پیدا کی ہو لیکن اس تجویز اور نئے قواعد کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اس کام کی تکمیل میں وقت صرف ہوتا۔

بہرحال وہ سب منزلیں گذر گئیں اور انجمن کی مجلس عاملہ نے گزشتہ ہفتہ یہ فیصلہ کردیا کہ ریاستی شاخ کی تشکیل کے ابتدائی مراتب کو طے کرنے کے لئے یکم جنوری ۱۹۵۴ء کو بہ مقام لکھنؤ شاخوں کے منتخبہ نمائندوں کا ایک جلسہ کرلیا جائے۔ چنانچہ نمائندوں کو عنقریب دعوت نامے بھیج دیئے جائیں گے۔

اس جلسہ میں پہلا کام یہ ہوگا کہ ریاستی شاخ کے ایک یا دو عہدہ دار منتخب کرلئے جائیں تاکہ وہ اس تنظیم کو متحرک اور باعمل کرنے کے دیگر لوازم کا انتظام کرسکیں اور حسب ضرورت ریاستی شاخ کے جلسے طلب کرسکیں۔ مجلس عاملہ کا انتخاب اور ریاستی شاخ کے قواعد و ضوابط کا بنانا ایسے ابتدائی کام ہیں جن کے بغیر یہ تنظیم متحرک نہیں ہوسکتی جب یہ نقشہ مکمل ہوجائے گا تو ریاستی شاخ اپنے کام کا کوئی ایسا پروگرام بناسکے گی جو تمام اتر پردیش پر حاوی ہو۔ اس کام میں بھی کافی وقت صرف ہوگیا۔ بہرحال مرکزی انجمن نے اب اس تجویز کو اس منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں ریاستی شاخ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکے۔ اور یہاں تک مرکزی انجمن کا کام ختم ہوجاتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ریاستی شاخ جب میدان عمل میں آجائے تو اس کے اور مرکز کے درمیان تصورات، ارادوں اور جدوجہد کا اشتراک قائم نہ رہے۔ کسی ریاستی شاخ کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اور مرکز کے درمیان اشتراک عمل اور پورا پورا ربط قائم رہے اور ہمیں یقین ہے کہ باوجود ان بدگمانیوں کے جو بعض حلقوں میں پیدا کی گئیں۔ اتر پردیش کی ریاستی شاخ اور مرکز کا اشتراک عمل غیر مشروط اور بغیر ذہنی تحفظات کے جاری رہے گا۔ اور اس کے بہترین نتائج حاصل ہوں گے۔

ایک مسئلہ اور بھی پیش نظر رہنا چاہئے۔ کام کرنے کے لئے روپیہ اور مالی امداد کی کمی کا شکوہ بھی بہت کچھ سنا جاتا ہے لیکن ہم عرض کریں گے کہ ریاستی شاخ کی جیب میں کوئی نقد سرمایہ تو ہوگا نہیں۔ لیکن وہ ان ہی مقامی اکائیوں کی مدد سے ضروری سرمایہ جمع کرے گی۔ جو اب تک موجود تھیں لیکن جن میں سے اکثر بے عمل ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کافی روپیہ کے بغیر یہ جدوجہد کامیاب نہیں ہوسکتی لیکن جب تک مقامی کارکنوں میں اتنا جوش عمل پیدا نہ ہو سرمایہ کی فراہمی آسان نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مرکزی انجمن کا سرمایہ اتنا نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے بار کو اپنے ذمے لے سکے اور دستخطی مہم میں بہت کافی روپیہ صرف کرنے کے بعد تو یہ صورت..... اور بھی زیادہ ناممکن ہوگئی ہے کہ وہ مقامی شاخوں یا صوبائی شاخ کی مالی امداد کرسکے۔ جب تک خود مقامی شاخیں اور ریاستی شاخ چندوں کے ذریعے سے ضروری سرمایہ فراہم نہ کرے۔ محض مرکزی انجمن پر سارا بار ڈالنے کا خیال ایک خیال خام ہے۔

مرکزی انجمن نے کبھی اپنی شاخوں سے کوئی خاص مالی امداد طلب نہیں کی۔ لیکن صرف ایک دفعہ جب غیر معمولی حالات کے تحت ایسا ہوا تو جو تلخ تجربے ہم کو حاصل ہوئے ان کا ذکر کرنے سے بھی منہ کا مزا تلخ ہوتا ہے جن شاخوں نے معمولی رقموں (پانچ سو یا ہزار) کے جمع کرنے کا وعدہ کیا وہ بہت جلد بغیر شرمائے ہوئے اپنا وعدہ بھول گئیں!! بہرحال شاخوں سے قطع نظر عوام کے دلوں میں اردو زبان کی محبت ضرور اتنی ہے کہ وہ ہر ایسی تحریک کی مالی امداد کریں گے۔ خواہ وہ کتنی ہی کم ہو۔ اسی لئے انجمن نے یہ ضروری سمجھا کہ ریاستی شاخ کو پوری طرح شاخوں کا نمائندہ بنایا جائے تاکہ اس کا اجتماعی اثر مقامی تحریکوں کو متاثر کرسکے۔ یہ کام ضروری ہے اور ہم کو یقین ہے کہ اس کی تکمیل میں اب کوئی تاخیر نہ ہوگی۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر باعمل تنظیم ایک اچھے کام کے لئے عوام سے مالی امداد حاصل کرسکتی ہے۔ اور یہ مالی امداد ایک ایسا عنصر ہوتا ہے جو عوام کو تحریکوں سے زیادہ وابستہ کردیتا ہے۔ اور یہی عوام کی گہری دلچسپی کا ایک امتحان ہوتا ہے۔ اس پہلو کو نظرانداز کرنا کسی تحریک کے لئے مفید نہیں ہوسکتا۔ ہنگامی ضرورتوں کے لئے بڑی بڑی رقمیں کسی نہ کسی طرح حاصل کرکے صرف کردینا تو آسان ہے۔ لیکن ایک پروگرام کو آگے بڑھانے کے لئے عوام ہی کا مسلسل ہمدردی اور ان ہی سے اشتراک ضروری ہوتا ہے۔

آئندہ یکم جنوری سے ریاستی شاخ اپنا کام شروع کردے گی اور یقین ہے کہ اس کی تنظیم کے استحکام میں زیادہ وقت صرف نہ ہوگا وہ اپنے لئے ترقی اور استحکام پیدا کرے گی اور مالی اعتبار سے بھی خود کفیل ہوگی۔

ایں خانہ تمام آفتاب است

یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے جس گوشے میں جایئے اگر چودہ زبانوں میں سے کسی زبان کے متعلق کوئی جھگڑا نظر آتا ہے تو وہ صرف اردو زبان ہے۔ مرہٹی یا بنگالی یا گجراتی یا تلگی وغیرہ کسی کی نسبت بھی ہندوستان کے کسی گوشے میں کوئی شکایت اور کوئی تنفیہ پیدا نہیں ہوتا۔ آخر یہ بات کیا ہے؟ اردو زبان کی بڑی بدقسمتی شاید یہی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہر گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور پھر بھی وہ کہیں کسی مقامی زبان کی رقیب نہیں ہے۔

حال ہی میں پارلیمنٹ کے ایک ممبر شری سادھن گپتا نے مرکزی وزیر تعلیم سے یہ سوال کیا تھا کہ:

(الف) اردو زبان کے متعلق اتر پردیش کی حکومت کے خلاف جو شکایات وصول ہوئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔

(ب) کیا ایسی شکایات کسی دوسری ریاست کے متعلق بھی وصول ہوئی ہیں۔
(ج) اگر ایسا ہوا ہے تو ان ریاستوں کے نام اور شکایات کی نوعیت بتائی جائے۔ اور
(د) یہ بھی بتایا جائے کہ ایسے معاملات میں متعلقہ ریاستی حکومت سے دریافت کرکے اور بغیر اس کے بھی کیا کارروائی کی گئی۔

آنریبل مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے جواب میں بتایا کہ (الف) (ب) اور (ج) کے متعلق بیانات لوک سبھا کی میز پر رکھ دیئے گئے ہیں۔
(د) کے متعلق انھوں نے فرمایا کہ عام طور پر ایسی شکایات ریاستی حکومتوں کو بھیج دی جاتی ہیں۔ نیز وہ شکایات جو اگست ۱۹۵۸ء تک وصول ہوئی تھیں۔ وزراء تعلیم کی کانفرنس میں پیش کی گئی تھیں۔ اور وہاں اس پالیسی کے متعلق جو مدارس میں ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کے متعلق طے پائی تھی ایک متفقہ قرارداد کانفرنس میں منظور ہوئی تھی اور وہ ریاستی حکومتوں کو تعمیل کے لئے بھیج دی گئی تھی۔

ریاست کا نام	شکایات کی نوعیت	ان کے متعلق کیا کارروائی کی گئی
بمبئی	(۱) پنچ محل کے اضلاع میں اردو پرائمری اسکولوں سے اردو زبان اڑا دی گئی ہے۔	اس شکایت پر وزراء تعلیم کی کانفرنس میں غور کیا گیا۔
	(۲) کیرا کے ضلع میں اردو اسکول بند کر دیئے گئے۔	ایضاً
	(۳) ضلع بیجاپور میں اردو اسکولوں کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ علاقائی زبان کنڑی کے ذریعے سے تعلیم دیں۔	ایضاً
	(۴) چونکہ بمبئی کی حکومت نے اردو کو علاقائی زبان تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس لئے اردو کے تمام ابتدائی مدارس بند کر دیئے جائیں گے اور تعلیم گجراتی کے ذریعے سے دی جائے گی۔	ایضاً
	(۵) بمبئی کی حکومت نے احمد آباد کے اردو ٹریننگ کالج کو بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔	ایضاً
مدھیہ پردیش	وہ طلبا جو اب تک مڈل کلاس تک اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کرتے تھے ان کو اب حکم دیا گیا ہے کہ ہندی استعمال کریں۔	ایضاً
مدراس	اس قسم کی افواہیں آ رہی ہیں کہ حکومت نے خفیہ احکام بھیج دئے ہیں کہ بہت جلد تمام اردو اسکول بند کر دیئے جائیں اور والدین کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو اسکولوں میں نہ بھیجیں لہذا حکومت کو ان افواہوں کی تردید کر دینی چاہئے۔	ایضاً
پنجاب	مدارس میں اردو کی جگہ ہندی اور پنجابی داخل کی جا رہی ہے۔	ایضاً
اترپردیش	ریاستی حکومت لسانی اقلیتوں کے وسیع مفادات کا لحاظ کئے بغیر اپنی مرضی کے موافق کام کر رہی ہے۔	ایضاً
	ایک اسلامیہ پرائمری اسکول (اردو) بند کیا گیا اور اس جگہ ہندی پرائمری اسکول قائم کیا گیا۔	ریاستی حکومت کو لکھا گیا جس نے یہ جواب دیا کہ اسکول بند نہیں کیا گیا بلکہ اس کا نام بدل دیا گیا ہے۔
	بہت سے مدارس میں ایسے بچوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے اردو میں تعلیم دینے کا انتظام نہیں کیا گیا۔	ریاستی حکومت کو لکھا گیا تھا اور اس نے جواب دیا ہے اس شکایت کی چھان بین کرنے کے لئے ایک خاص افسر مقرر کر دیا گیا ہے۔
	الہ آباد کے جونیر ہائی اسکول کے نصاب میں اردو کو اس کی مناسب جگہ نہیں دی گئی ہے۔	چونکہ اصل شکایت ریاستی حکام کو بھیجی گئی ہے اس لئے مرکزی حکومت کو کسی کارروائی کرنے کی ضرورت نہ تھی
	ریاستی حکومت نے وزراء کی کانفرنس کے سلسلے میں جو احکام جاری کئے ان پر سرکاری عہدے داروں نے کوئی عمل نہیں کیا۔	اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی ایک یادداشت وصول ہوئی ہے جس پر صدر جمہوریہ غور فرما رہے ہیں۔

ریاست کا نام	شکایات کی نوعیت	اس کے متعلق جو کارروائی کی گئی۔
	حسب ذیل شکایات اگست ۱۹۵۸ء کے بعد وصول ہوئیں	
حیدرآباد	اردو، فارسی اور عربی کو ختم کرنے کے طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔	ریاستی حکومت کو توجہ دلائی گئی اور یہ معلوم ہوا کہ اعلیٰ ثانوی تعلیم میں ان زبانوں کو جاری رکھا گیا ہے اور تمام سرکاری اور ابتدائی اور ہائی اسکولوں میں انتظامات کئے گئے ہیں کہ جہاں ایک کلاس میں پندرہ اردو پڑھنے والے طالب علم ہوں وہاں اردو زبان کے ذریعے سے ان کو تعلیم دی جائے۔
مدھیہ پردیش	ناگ پور کارپوریشن کے اردو ابتدائی مدارس بند کئے جا رہے ہیں۔	اس سوال پر ریاستی حکومت سے خط و کتابت کی جا رہی ہے۔
پیپسو	ریاستی حکومت نے حکم دیا ہے کہ پنجابی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اس کی وجہ سے ان مسلمانوں کو سخت دقت پیش آ رہی ہے جو اردو بولتے ہیں۔	ریاستی حکومت کو لکھا گیا ہے۔ اور اس کے جواب کا انتظار ہے۔
مغربی بنگال	سخاوت میموریل گرلس اسکول کلکتہ سے اردو کے کلاس ختم کر دئے گئے۔	ریاستی حکومت سے معلوم ہوا ہے کہ باوجودیکہ اردو بولنے والی لڑکیوں کی تعداد کم ہے لیکن ان کے لئے اردو کی تعلیم جاری رکھی گئی ہے اور ریاستی حکومت نے اس بات کو منظور کر لیا ہے کہ یہ انتظام ایک سال اور قائم رکھا جائے۔
بمبئی	ثانوی مدارس میں اردو کی تعلیم ختم کر دی گئی۔	ریاستی حکومت کو لکھا گیا ہے۔

یہ ایک خاکہ ہے ان حالات کا جن سے ہندستان کے ہر گوشے میں اردو زبان دوچار ہو رہی ہے۔ ہم کسی دوسری فرصت میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ان حقائق کو پیش کریں گے اور بتائیں گے کہ اردو کا مسئلہ ایک آل انڈیا مسئلہ ہے اور اسی اساس پر اردو کی حفاظت کے انتظامات اردو والوں کو کرنے ہوں گے۔ تنہا اتر پردیش کا محاذ ہماری جد و جہد کے لئے کافی نہیں ہے۔

ہلکے ہلکے اشارے

—— "کیا آپ کنڈی ڈیٹ ہیں؟"

"نہیں حضور"

"پھر باہر نکل جائیے"

"کیوں نکل جاؤں باہر؟ میں تو امیدوار ہوں"

"کیا کہا" امیدوار ! کسے کہتے ہیں امیدوار؟"

"آپ الیکشن کے بڑے افسر ہیں آپ اتنا بھی نہیں جانتے؟"

"اچھا فوراً نکل جاؤ باہر جانتے ہو میں پریزائیڈنگ آفیسر ہوں ... اندر کنڈی ڈیٹ کے سوا کوئی نہیں آ سکتا۔"

"حضور آپ بڑے افسر ہیں مگر میں بھی تو کانگریس کا امیدوار ہوں مجھے پہچانئے تو سہی۔"

—— کانگریس کا نام سن کر پریزائیڈنگ آفیسر صاحب تھوڑے سے بھنائے لیکن ان کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا تھا کہ "امیدوار" کس جانور کا نام ہے۔

"اچھا تو کسی کانگریسی نیتا کو بلایئے۔"

پریزائیڈنگ افیسر صاحب نے قدرے نرم لہجہ میں کہا۔ کانگریسی نیتا آگئے!

"کیوں صاحب آپ انھیں جانتے ہیں، یہ کنڈی ڈیٹ تو نہیں ہیں۔ اندر گھسے چلے جاتے ہیں۔ اور منع کرنے پر خود کو ... بتاتے ہیں ذرا انھیں سمجھا کر باہر لے جایئے۔"

نیتا جی نے انگریزی میں کنڈی ڈیٹ اور "امیدوار" کا رشتہ بتایا۔ اور ادھر اپنے کانگریسی امیدوار کے دماغ میں لفظ "کنڈی ڈیٹ" کا مفہوم ٹھونسا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا!

—— یہ دلی میونسپلٹی کے حالیہ الیکشن کا ایک چھوٹا سا لطیفہ ہے دلی کے شہریوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے کانگریس کی جانب سے جو امیدوار نامزد کئے گئے تھے، اسی ذخیرے کا ایک دانہ یہ بھی ہیں جو کنڈی ڈیٹ تو نہیں صرف "امیدوار" ہیں اور اسی پر یہ سکائیش بھی ہیں کہ دلی کے انتخابات میں کانگریس اپنی توقع کے خلاف کیوں شکست کھا گئی۔

"قیاس کن ز گلستان من بہار مرا" (بیاب بہار شود)

——— "امیدوار" اور "کنڈیڈیٹ" کے درمیان فاصلہ بہت ہے! گویا یہاں بھی اردو کے مقابلے میں انگریزی کا بول بالا ہے مگر ہندی کا بول بالا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ وہ سرکاری زبان ہے ایسا ہونا ہی چاہئے۔ لیکن بہرحال، اردو زبان کے مقابلے میں تو انگریزی بھی پیاری ہے!

——— اور یہ پریزائیڈنگ انیسر تھے کون؟ ہندوستانی یا انگریز؟ آزادی کے بعد ہماری دنیا کیسے کیسے لطائف و ظرائف سے آباد ہے!!

تمام ہندوستان میں صرف یوپی اور دہلی ہی دو ایسے صوبہ جات ہیں جہاں کہ اردو پڑھنے اور اردو بولنے والوں کی تعداد بہت کافی ہے اور جہاں کہ اردو کو علاقائی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور یوپی کے اردو پڑھے ہوئے بیس لاکھ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے دستخطوں سے ہندوستان کے صدر جمہوریہ مسٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں ایک میموریل بھی بھیجا۔ مگر یہ لطیفہ بے حد دلچسپ ہے کہ یوپی کے ہوم منسٹر ڈاکٹر سمپورنانند نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"یوپی میں کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اردو کو یوپی میں علاقائی زبان قرار دیا جائے ...."

خوب! جیلوں میں رات کو پہرہ دینے والے ایک آواز دیا کرتے ہیں "سب خیریت ہے" اور یہ آواز اس وقت بھی دی جاتی ہے جب کہ قیدی گھٹی اور حبس کے باعث رات کو کوٹھریوں کے اندر سو نہ سکتے ہوں۔ ان میں کئی بیمار ہوں اور جن کو زمانہ حال و زمانہ مستقبل دونوں تاریک نظر آتے ہیں۔ جیلوں میں اس "سب خیریت ہے" کی طرح ڈاکٹر سمپورنانند بھی ہندی ساہتیہ سمیلن میں اردو کے متعلق کہتے ہیں کہ یوپی میں کوئی اردو پڑھنے اور بولنے والا زندہ نہیں رہا۔ یعنی خیریت ہے۔ چنانچہ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان بیس لاکھ دستخط کرنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کو کیا چھلاوے سمجھ لیا گیا ہے۔ کیونکہ آپ کے خیال میں تو یوپی میں کوئی ایک انسان بھی نہیں چاہتا کہ وہاں کی علاقائی زبان اردو ہو۔

ڈاکٹر سمپورنانند کے اس بیان کے ساتھ ساتھ اگر یوپی کے وزیر اعلیٰ پنڈت پنت کا وہ بیان بھی پڑھ لیا جائے جس میں آپ نے اردو کی اہمیت کا اقرار کیا ہے تو یوپی کے وزراء کی غیر ذمہ داری کی داد بھی دی جا سکتی ہے کیونکہ ایک وزیر تو کہتا ہے کہ اردو کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور دوسرا وزیر کہتا ہے کہ اردو پڑھنے والے سب مر چکے ہیں اس زبان کا بولنے والا کوئی زندہ ہی نہیں رہا۔

——— ہماری مانگ ہے کہ مرکزی گورنمنٹ کا محکمۂ تعلیم یوپی اور اردو کے سلسلے میں مداخلت کرے اور اس صوبے کو ایسی دو عملی کی اجازت نہ دی جائے۔ (ریاست دہلی)

——— دوا اور دعا دونوں کو آزمایا جا رہا ہے، لیکن یہ مرض طبیب اور عامل (مرکزی حکومت) دونوں کے قبضے سے باہر ہے۔

——— لکھنو ۹ر نومبر۔ اکھل بھارتیہ جن سنگھ کے جنرل سکریٹری ماسٹر دین دیال اپادھیائے اردو زبان کے سلسلے میں اپنی جماعت کا نقطۂ نظر بتاتے ہوئے آج شام کہا "اردو کے لئے زیادہ سے زیادہ ہم اتنا کر سکتے ہیں کہ اس کو برداشت کرتے رہیں۔"

اپادھیائے جی نے جو یہاں اخباری نمائندوں کی کانفرنس کو خطاب کر رہے تھے۔ یہ بات اس وقت کہی جب ایک نمائندے نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ بھی اردو کو ہندی ہی کا ایک اسلوب سمجھتے ہیں؟

اپادھیائے جی نے جب اثبات میں جواب دیا تو اسی نمائندے نے پوچھا "ہندی کے ایک اسلوب ہی کی حیثیت سے اردو زبان کو ترقی دینے کے لئے آپ کی جماعت نے اب تک کیا کیا ہے؟

جواب: کچھ نہیں۔

دوسرے نمائندے نے پوچھا "اردو کو ترقی دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟"

جواب: "نہیں، ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اسے برداشت کرتے رہیں۔"

اپادھیائے جی نے یہ تسلیم کیا کہ اردو کی پیدائش ہندوستان ہی میں ہوئی مگر خیال ظاہر کیا کہ "اس زبان کے اندر جو ادب ہے وہ علاحدگی پسند رجحان کو تقویت دیتا ہے۔ جس کی بدولت ایک قوم کا تخیل پروان نہیں چڑھ سکتا۔"

انھوں نے بتایا کہ "ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود اردو زبان، رستم و سہراب اور گل و بلبل کے ذکر سے بھری ہے۔ اسے ہندوستان کے پرند اور یہاں کی کوئل نہیں دکھائی دیتی۔"

سوال: "کیا ہندوستان میں گل اور بلبل نہیں ہوتے؟"

جواب: "ہوتے ہوں گے؟"

سوال: "کشمیر میں بھی گل و بلبل اسی طرح ہوتے ہیں جیسا کہ ایران میں، تو کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے یا نہیں؟"

اپادھیائے جی نے کہا "کچھ ہو، اردو کے لئے جدوجہد کرنے والا انداز دو قومی نظریے سے ملتا جلتا ہے اور ہندوستان کا ہر مسلمان خواہ وہ جنوبی ہند کا رہنے والا ہو اور ٹوٹی پھوٹی اردو ہی جانتا ہو اردو کو اپنی زبان کہتا ہے۔"

——— لیجئے فیصلہ ہو گیا! بھارت کے جن سنگھی بس زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ اردو زبان کم بخت کی گندگی کو برداشت کرتے رہیں!! ——— غریب اردو والوں کے لئے یہی الطاف و

کرم کیا کم ہے!!

کشمیر کے "گل و بلبل" کو بھی وہ نہیں مانتے ـــــ اور ہندستان میں اگر گل و بلبل ہوتے ہیں تو یقیناً پاکستانی اور مسلم لیگی ہیں!

انجمن کی خبریں

علی گڑھ ۲۲؍نومبر ۵ بجے دن کو انجمن ترقی اردو شاخ مسلم یونیورسٹی کے عہدہ داروں کا سالانہ انتخاب یونین ہال میں ہوا کارروائی شروع ہونے سے پہلے عابد اللہ صاحب غازی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ یونیورسٹی نے سال گزشتہ کی روداد پیش کرتے ہوئے اپنی مختصر تقریر میں ممبران سے درخواست کی کہ وہ اردو کی بقا کے لئے ذاتی اختلافات کو نظر انداز کر کے ایسے لوگوں کو منتخب کریں جو صحیح معنوں میں اردو کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں، اور انجمن کے دستور کا احترام کرتے ہوئے انجمن کی خدمت کر سکیں۔

انتخابات لطف الرحمٰن صاحب صدیقی فیروز صدر شاخ مسلم یونیورسٹی کی نگرانی میں ہوئے اور ممبران نے ذاتی دلچسپی اور جوش و خروش کے چند مظاہروں کے باوجود نظم و ضبط سے کام لیا اور اصحاب ذیل نئے سال کے لئے عہدہ دار منتخب ہوئے۔

انیس شروانی صاحب	صدر
نور سلیمان صاحب، سلطان محی الدین صاحب،	نائبین صدر
سلطان علی صاحب شیدا،	جنرل سکریٹری
رام سنگھ صاحب، انوار احمد صاحب،	جوائنٹ سکریٹری
صادق الرحمان قدوائی صاحب	خازن

ورکنگ کمیٹی چونکہ چودہ ممبران پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لئے ممبران نے رائے دی کہ دس ممبروں کا انتخاب اسی وقت ہو جائے اور چار کا انتخاب عہدہ داران مجلس منتظمہ بعد میں کریں گے۔ اس کے لئے پندرہ نام پیش کئے گئے، چونکہ نو اصحاب کے بعد ۲ صاحبوں کے ووٹ برابر ہو گئے۔ اس لئے گیارہ احباب کا انتخاب کیا گیا جن کے نام یہ ہیں۔

ظفر امام، رشید شروانی، ایوب سعید، جوگندر سنگھ ام۔ اے۔ ملک۔ شفیع الرحمان قریشی۔ محمد قاسم صدیقی، آزاد قاسمی، برہان الدین، محمد احسن، صلاح الدین۔

سابق صدر لطف الرحمٰن صدیقی فیروز اور جنرل سکریٹری عابد اللہ غازی بہ لحاظ منصب مجلس منتظمہ میں شامل رہیں گے۔

(نامہ نگار)

بنگلور مسلمانان ریاست میسور کے ایک نمائندہ اجلاس میں منجملہ دوسری قراردادوں کے اردو کے متعلق حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

(۱) تمام اردو پرائمری مدارس مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کی غرض سے بحال رکھے جائیں اور سکنڈری کورس میں اردو، ہندی، یا انگریزی کو بھی کنڑی زبان کے علاوہ ذریعہ تعلیم بنانے کا انتظام کرائیں۔

(۲) مسلمانان ریاست میسور کا یہ اجلاس افسوس کے ساتھ دیکھتا ہے کہ مجلس نصاب میں جس کی امسال حکومت میسور کی طرف سے تشکیل کی گئی ہے۔ کوئی بھی اردو داں رکن شامل نہیں ہے۔ حالانکہ پرائمری سکینڈری اور ٹیچرس ٹریننگ کالجوں میں اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اس لئے حکومت سے سفارش کی جاتی ہے کہ مجلس نصاب میں اردو فارسی و عربی جاننے والے اراکین بھی شامل کئے جائیں۔

(۳) مسلمانان ریاست میسور کا یہ اجلاس حکومت سے پرزور سفارش کرتا ہے کہ آکاش وانی ریڈیو کے پروگرام میں اردو کو دوبارہ بحال کیا جائے۔

بالوٹرہ ہرونش لال ساہنی صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ:۔ بالوٹر ۲۳؍نومبر گزشتہ مہینے مقامی ادیبوں، شاعروں، طالب علموں اور ادب ذوق حضرات نے بالوٹرہ ادبی سبھا قائم کی ہے۔

ادبی سبھا کے عہدہ دار مندرجہ ذیل حضرات منتخب ہوئے۔

صدر: جناب عبدالوہاب صاحب شستی۔ جنرل سکریٹری ہرونش لال ساہنی جائنٹ سکریٹری درشن لال صاحب۔ خزانچی جناب محمد ادریس صاحب اور ادبی سبھا کے سرپرست جناب حکیم ہاشم بیگ صاحب

ادبی سبھا نے زور شور سے ادبی سرگرمیاں شروع کر دی ہیں اور اس قلیل عرصے میں بھی ادبی سبھا کی طرف سے دو ادبی اجلاس ہو چکے ہیں، جو بہت کامیاب رہے۔

علی گڑھ اپنی ادبی سرگرمیوں کے اعتبار سے حلقہ ادب این۔ آر۔ ایس۔ سی ہال کا یہ تعلیمی سال نہایت شاندار ہے۔ ۳؍دسمبر ۱۹۵۵ء کو حلقہ کے زیر اہتمام ایک انعامی مباحثہ منعقد ہوا۔ مباحثہ کا موضوع تھا "سائنس نے انسانیت کو نفع سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے"۔ جلسہ ہر اعتبار سے نہایت کامیاب رہا۔ شروع میں حلقہ ادب کے سکریٹری محمد عامر نے حلقے کے ادبی سرگرمیوں پر جو اس تعلیمی سال کے دوران میں ہوئی ہیں مختصر تقریر کی۔ جناب ڈاکٹر قدوائی صاحب شعبہ کیمسٹری جناب ڈاکٹر مقبول احمد صاحب شعبہ اسلامیات سے جناب ڈاکٹر رئیس احمد صاحب شعبہ فزکس سے بہ حیثیت جج مدعو کئے گئے تھے جج صاحبان کی رائے کے مطابق تقریروں کا عام معیار بہت بلند تھا۔ مندرجہ ذیل طلبا کو انعامات دیئے گئے ہیں۔

انگریزی اول۔ رگھبیر پرشاد — اردو اول۔ شمیم احمد

دوم پرتھوی راج — " دوم محمد الیاس

(نامہ نگار)

اخبار تماشا کے ایک

اداریہ کے اقتباسات

زمانے کب کسی کی قدر کی ہے جو عصمت کی کما حقہ قدر کرتا۔ یہ زمانہ کی خاص خصوصیت ہے۔ خاص طور پر ہمارے ہندوستان میں جہاں میر اور غالب جیسی ہستیاں حافظ کے اس شعر پر اکتفا کرنے پر مجبور رہے۔

بہ ہنگام تنگ دستی در عیش کوش و مستی
کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

میر و غالب کی داد سب نے دی اور ان کے کمال کے سب قائل ہے مگر
مگر یہ کہ کسی نے اتنا نہ کیا کہ۔
"بیچ کر نا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"
غلط اور مہمل ثابت ہو جاتا۔ ہمارے مرزا عصمت کے ساتھ اس سے بھی کچھ کم ہی ہوا۔

باوجودیکہ آج یہ تلخ حقیقت بالکل واضح ہے کہ نہ صرف گیسوئے اردو منت پذیر شانہ ہے۔ بلکہ ان دل پذیر گیسوؤں کو یار لوگ اُسترے سے مونڈنے بیٹھے ہیں۔ کسی نے اس بات کی داد نہ دی کہ عصمت کے دم سے آرائشِ بزم کاکل کا کیا اہتمام تھا۔ مجھے انتہائی مسرت ہوگی اگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہو کہ حیدرآباد کو ابھی تک معلوم نہیں کہ اردو ادب میں عصمت کا اگر پایہ نہ سہی تو بھی ان کی کیا جگہ ہے۔ ممکن ہے اب جبکہ عصمت ہمارے ساتھ نہیں ہیں، مبصرین اور نقاد اور اردو ادب کے معلمین کرام ان پر مقالے لکھیں اور اردو ادب کی جو خدمت انھوں نے کی اس پر منظر عام پر لا کر گزشتہ کی ناقدری کی تلافی کی کوشش کریں، تو ہمارے ملک میں ایسا تو ہوتا ہی آیا ہے۔ ہم لوگ لکیر پیٹنے کے عادی ہیں، مگر اس بارے میں بھی سخت اندیشہ ہے۔ عصمت کا کلام اور ان کی تصنیفات زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں۔ اور پہلا مرحلہ یہی ہے کہ ان کی اشاعت کا مناسب و معقول بندوبست کیا جائے۔ جب تک ایسا نہ ہو ظاہر ہے کہ لکیر پیٹنی بھی دشوار ہوگی۔

میرے نزدیک اردو ادب میں عصمت کی ایک خاص جگہ ہے جس کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یعنی یہ کہ ان کی شاعری اردو ادب کی ایک زبردست کمی کو پورا کرتی ہے۔

یوں تو مرزا صاحب کے ادبی کارناموں میں اور آرٹ کی خدمت کے سلسلے میں ڈرامہ، تمثیل، مضمون نگاری، مختصر کہانیاں، درسی کتب کی تصنیف، ڈرائنگ اور پینٹنگ وغیرہ سب گنوائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کی جو امتیازی خصوصیت تھی، وہ ان کی شاعری ہے جو اپنی آپ نظیر ہے۔ زمانہ حال کے اردو ادب پر ایک طائرانہ نظر ڈالئے تو کہیں آپ کو بلند پایہ ادیب اور ظرافت نگار کا پتہ نہیں چلے گا سوائے ایک نام رشید احمد صدیقی کا لیا جا سکتا ہے۔ اور وہ بھی نثر کی حد تک......

مرزا عصمت کی شاعری سراپا ظرافت ہونے کے باوجود عصمت کے پردوں میں ہی رہی۔ کہیں بھی وہ ثقاہت سے دور نہیں ہے۔ اسی طرح خاص میں بہت سنجیدہ مضامین بیان کا کلام ہے "میرا وطن" "قائیوا" "پلاش محالی کلدار" "سالار جنگ میوزیم" اور بیسیوں ایسی نظمیں نہ صرف ادبی حیثیت سے بلند ہیں۔ بلکہ عصمت کی فنکاری اور مہارت کا بھی مخصوص نمونہ ہیں۔ نیز ان میں ظرافت کا رنگ بھی مہر تاباں کی طرح روشن ہے اور ظرافت بھی ایسی کہ کسی کی دل آزاری کا شائبہ تک نہیں۔ جیسے وہ خود مقبول خاص و عام تھے۔ ویسے ہی ان کا کلام ہر طبقہ کے سامعین میں مقبول رہا۔

مشاعروں میں جب مرزا عصمت کی باری آتی تو ایک خوشی کی لہر دوڑ جاتی اور حاضرین جب ان کا کلام سنتے تو ہنستے ہنستے لوٹ جاتے۔ افسوس کہ اب یہ ہنسانے والا شاعر ہم میں نہیں رہا۔ اتفاقی ارتقا میں ظرافت کا جو حصہ اور مقام ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ آزاد ہند میں ایسے ادب کی کمی بہت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ ایسے وقت میں مرزا کا یکایک خاموش ہو جانا اور اہل عالم کی ناقدری سے ان کا دل ہمیشہ سے بیٹھ جانا ایک عظیم سانحہ کے علاوہ قومی نقصان بھی ہے۔

اس نقصان کی تلافی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ان کا گراں قدر ترکہ جو انھوں نے قوم کے حق میں چھوڑا ہے یعنی ان کے تصانیف اور کلام کا ذخیرہ محفوظ کیا جائے۔ اور اس کی مناسب اشاعت کی جائے ورنہ ہم اپنے پیروں پر کلہاڑی مار کر ایک اور شدید محرومی مول لیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو بالخصوص ان کے قریب ترین دوستوں اور قدر شناسوں کو چاہئے کہ یادگار عصمت شدہ اور مضبوط بنیادوں پر قائم کریں تاکہ نہ صرف ہماری زبان کی ترقی ہو بلکہ یہ بھی کہ عصمت کے گوشت اور پوست کی یادگاریں بھی جن کو نہ معلوم اب کن کن حوادث کا سامنا کرنا پڑے۔ اس سے خاطر خواہ تمتع حاصل کر سکیں۔

اس کی ضرورت نہ ہوتی اگر مقتدر ہستیاں مرزا عصمت کو اپنی عام و خاص محفلوں میں ایک کھلونے سے زیادہ نہ سمجھتے اور اپنا اثر رسوخ اور اقتدار اس طرح کام میں لاتے کہ عصمت نیز ان کے پسماندگان بے فکری کے ساتھ گذر بسر کر سکتے۔

مرزا صاحب ساری عمر ہم سب کو ہنساتے رہے اور اب بھی وہ رحمت حق سے باغ جناں میں خنداں ہوں گے تو اب ہمیں بھی چاہئے کہ ہم کم از کم ان کے اہل و عیال کو رونے نہ دیں.......

جواب طلب امور کے لئے کارڈ یا دو آنے کا ٹکٹ
آنا ضروری ہے

ایک باہر کی آواز

یاران تیزگام نے منزل کو جالیا

ہر باشعور اور عظیم قوم اور اس کی حکومت کو اپنی تہذیب اپنے کلچر، اپنی زبان و ادب کا بڑا پاس ہوتا ہے۔ انگریز قوم کو اسی لئے تو ہندستان کی سلطنت سے زیادہ شیکسپیر عزیز تھا۔ ہمارے پڑوسی ملک ہندستان نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے۔ ہندستان کے دانش ور، خیرسگالی کے وفد لے کر غیر ملکوں میں جاتے ہیں اور اپنی تہذیبی فوقیت کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہندستان نے یہ بات بھی سمجھ لی ہے کہ اردو زبان و ادب کے کارناموں کو نظر انداز کرنا ہندستانی ثقافت کے لئے زہر قاتل ہوگا۔ ہندستان کی "اردو دشمنی" بھی اب ایک قصۂ پارینہ بنتی جارہی ہے۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ آج ہندستان میں اردو کے ادیبوں اور مفکروں کا مستقبل پاکستان کی نسبت زیادہ محفوظ ہے۔ حکومت ہند نے مولانا حسرت موہانی کی بیوی کو ڈھائی سو روپے ماہانہ کی پنشن دے کر اپنی وسعت قلب کا اظہار کیا ہے اور اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ ہندستان اپنے مرے ہوئے دانش وروں اور مجاہدین آزادی کو یاد کرنے کی صلاحیت اور شعور رکھتا ہے۔

اس سلسلے کا حالیہ کارنامہ یہ ہے کہ حکومت ہند نے مختلف زبان کے ادیبوں اور فن کاروں کو ماہانہ وظیفے عطا کئے ہیں ان وظیفہ پانے والوں میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اس کا اندازہ اس فہرست سے کیجئے۔

عربی زبان ایک، گجراتی تین، مرہٹی۔ دو، پنجابی۔ ایک سنسکرت چار، بنگالی سات، ہندی نو، اور اردو چودہ،

اس طرح حکومت ہند نے بنگالی اور ہندی (ہندستان کی سرکاری زبان) کے مقابلے میں اردو کی فوقیت کو عملی طور پر تسلیم کرلیا ہے جن ادیبوں کو وظیفے دیئے گئے ہیں وہ اردو کے مخلص اور دیرینہ خادم ہیں، اور حکومت ہند نے ان کے انتخاب میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے حضرت بیخود دہلوی، مرزا یگانہ چنگیزی، جوش ملسیانی، ماسٹر جگت سنگھ پیارے لال شاکر میرٹھی، مانی جائسی اور جناب نوح ناروی ان فن کاروں میں شامل ہیں۔

ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

اب ہم اپنی سات سالہ تاریخ پر نظر ڈالیں تو اپنی حکومت کا کوئی ایسا کارنامہ یا فیصلہ نہیں ملتا۔ ویسے تو کبھی کبھی علم و دانش کا ذکر ہمارے صاحبان اقتدار ضرور کردیتے ہیں۔ لیکن ہمارے فن کار بے عمل ہیں اور ہمارے شاعر اپنے خون جگر سے ایوان ثقافت کو آراستہ کرنے سے غافل رہتے ہیں۔ کاش ہماری حکومت ہندستان کی اس مثال سے سبق حاصل کرے اور پاکستانی تہذیب و ثقافت کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے اس سے بڑا کوئی قدم اٹھائے۔

(قومی زبان۔ کراچی)

سلیمان ہال کی تعمیر

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا وطن دیسنہ ضلع پٹنہ ریاست بہار میں ایک قدیم تعلیم یافتہ اور مردم خیز گاؤں ہے یہ ایک صدی سے علم و فضل کا گہوارہ ہے۔ یہاں ہر زمانہ میں بڑے بڑے اصحاب علم اور ارباب کمال پیدا ہوئے۔ یہاں کے علم و ادب کے شیدائیوں نے نصف صدی سے ایک اردو کتب خانہ قائم کر رکھا ہے جس میں اردو کی تقریباً تمام مطبوعہ کتابیں اور بہت سے قلمی نوادر موجود ہیں ان کی مجموعی تعداد دس ہزار کے قریب ہوگی۔ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندستان کا کوئی کتب خانہ شاید ہی اس کا مقابلہ کرسکتا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے دور دور سے اصحاب ذوق آتے رہتے ہیں۔ ریاست بہار کے وزراء اور مشاہیر کے علاوہ ڈاکٹر راجندر پرشاد (صدر جمہوریہ ہند) بھی تشریف لاکر اس کتب خانہ کو رونق بخش چکے ہیں۔ ان سب نے اس کتب خانہ کی ترقی میں مدد دی ہے۔

اردو کے مایہ ناز ادیب اور بے مثل اہل قلم علامہ سید سلیمان ندوی کو اپنے وطن کے کتب خانے سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس کی تعمیر و ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ مئی ۱۹۵۳ء میں جناب محمد عزیز منعمی صاحب بالقابہ وزیر جیل و بجالیات صوبہ بہار کی صدارت میں اس کتب خانہ کی پچاس سالہ طلائی جوبلی منائی گئی تھی۔ اس جوبلی میں یہ طے کیا گیا تھا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اردو زبان کو جو اپنی بیش بہا خدمات سے گراں بار کیا ہے۔ اس جذبہ احسان شناسی میں ان کی یادگار ان کے وطن کے کتب خانے سے ملحق ایک وسیع ہال تعمیر کیا جائے، اس کی تعمیر میں اٹھارہ ہزار روپے صرف ہوں گے۔

مولانا مرحوم جیسی جلیل القدر اور عظیم المرتبت شخصیت کے مقابلے میں یہ کوئی بڑی یادگار نہیں اور اٹھارہ ہزار کی رقم بھی کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ اس کو صرف ریاست بہار کے لوگ آسانی سے فراہم کرسکتے ہیں۔ مگر مولانا مرحوم کی شخصیت کسی خاص گاؤں یا خاص ضلع یا خاص ریاست یا خاص ملک کے لئے نہ تھی۔ ان کے علم و قلم کے سرچشمے سے ہر طبقہ سیراب ہوا، اس لئے اس کے عقیدت مندوں کا دائرہ ہر جگہ پھیلا ہوا ہے، ان

کے قدردان اپنی عقیدت کا اظہار ان کی مجوزہ یادگار کی تعمیر میں مالی مدد دے کر کرسکتے ہیں۔ دلیسنہ کے کتب خانے میں سلیمان ہال کی تعمیر اردو زبان کی بھی بڑی گراں مایہ خدمت ہے۔ کیونکہ یہ کتب خانہ اردو زبان کا بڑا مرکز ہے۔ اس لئے ہم کو توقع ہے کہ ہندوستان کے تمام لوگ خصوصاً اس کا علمی طبقہ اس یادگار کے قیام میں پوری مدد دے گا ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

الملتمسین

دستخط	عبدالستار صدیقی	سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی
″	عبدالماجد دریابادی	مدیر صدق و صدر مجلس ارکان دارالمصنفین اعظم گڑھ
″	سید مسعود حسن رضوی	سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی
″	قاضی عبدالغفار	سکریٹری کل ہند انجمن ترقی اردو علی گڑھ
″	شاہ معین الدین احمد ندوی	ناظم شعبۂ علمی دارالمصنفین اعظم گڑھ
″	عبدالسلام ندوی	مصنف شعرالہند و رکن رکین دارالمصنفین اعظم گڑھ
″	مسعود علی ندوی	ناظم شعبۂ مال دارالمصنفین اعظم گڑھ
″	ابوالحسن علی ندوی	معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

(نوٹ) منی آرڈر، چک یا رقم حسب ذیل میں سے کسی ایک پتہ پر ارسال کیجئے۔

(۱) پروفیسر سید محمد سید رضا۔ دلیسنہ۔ پوسٹ دلیسنہ ضلع پٹنہ

(۲) پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی۔ صدر شعبۂ اردو۔ اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی ۲۰

(۳) جناب ایس۔ ایس دلیسنوی۔ پرنسپل صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

میر تقی میرؔ

افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق صاحب ایم۔ اے ڈی فل آکسفرڈ ممبر پبلک۔ سروس کمیشن مدراس لکھتے ہیں :-

"ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی کی کتاب "میر تقی میرؔ حیات اور شاعری" فی الحقیقت میرؔ اور عہد میرؔ پر ایک محققانہ انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جس جامعیت کے ساتھ خواجہ صاحب نے میرؔ کی حیات اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کے علاوہ میرؔ کے تاریخی ماحول کے متعلق معلومات پیش کئے ہیں اور تبصرہ فرمایا ہے وہ اردو ادب کے لئے ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ تاریخ زبان و ادب اردو میں اس کتاب کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور یہ اپنی آپ نظیر ہے۔"

غالب اور غم روزگار

(از حمیدہ سلطان صاحبہ)

شعرا سلف کے نزدیک شعر اپنے خیال کے اظہار کا ذریعہ ہے سوانح اور تاریخ کسی ایک فرد کا کریکٹر اور اصل واقعہ پیش کرتی ہے، شعر مناظر فطرت اور مقاصد حیات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ لیکن اس میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اشارے کنائے کے ذریعہ سے، راستی اور سچائی سوانح اور تاریخ کا ضروری جزو ہیں تو کیفیات قلبی شاعری کی جان ہیں۔ ایک فلسفی کا مقولہ ہے "شاعری انسان کی اس فطری خواہش کا نتیجہ ہے کہ جن چیزوں کو وہ دیکھے یا سنے ان کو اپنے طور پر پیش کرے۔ یا جو خیالات اور جذبات اس کے دل میں موجزن ہوں ان کو ظاہر کرے" جب ہی تو شاعری کو ملک اور قوم اور سوسائٹی کے حالات کا آئینہ کہا جاتا ہے ہر شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہے۔ وہ خود قصداً کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ جن حالات سے اس کا دل متاثر ہوتا ہے اور جو کیفیات اس کے قلب پر گذرتی ہیں وہ شعروں کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔

مرزا غالب نے اپنے ماحول کے مطابق میدان تغزل سے قدم نہیں اٹھایا۔ لیکن غزل گوئی میں ان کا راستہ جدا تھا اور اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ جہاں تھے وہیں تنہا کھڑے ہیں کوئی ان کا حریف نہ بن سکا۔ مرزا کی شاعری تمام و کمال مغل سلطنت کے زوال و انحطاط کا مرثیہ ہے۔ جب وہ مغل دربار کے شاعر تھے تو اکبری دبدبہ رہا تھا نہ شاہجہانی شکوہ۔ مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت پر عالم نزع طاری ہو چکا تھا۔ اور اس اجڑی ہوئی بزم کا آخری چراغ باد مخالف کے طوفانی جھونکوں کی زد پر تھا۔ لال قلعہ اب اپنے عہد رفتہ کے جاہ و حشم، شان و شکوہ کا ایک خزاں زدہ منظر رہ گیا تھا۔ تاہم امارت جا چکی تھی مگر امارت کا نشہ اس کے رگ و پے میں باقی تھا۔ شہنشاہی دبدبہ کے دن کب کے ختم ہو چکے تھے۔ لیکن ایک ساز شکستہ ابھی سُر دیئے جا رہا تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ مجالس ہوتی تھیں۔ بہادر شاہ کے استاد حضرت ذوق دہلی پرانی دھن الاپ رہے تھے۔ لیکن غالب نے اس انقلاب پر ایک مفکرانہ نظر ڈالی، وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ محفل اب قریب ختم ہے۔ شمع کی اداسی، سامان نشاط کی برہمی، فضا کی افسردگی ماحول کی المناکی۔ یاس و قنوط کی فراوانی اس سے سب کچھ کہہ گئی تھی اس لئے واردات حسن و عشق کے بیان کرنے کے لئے انھوں نے اپنی شاعری کو وقف نہیں کیا۔ اور اپنے معاصر شعرا کی طرح زلف و گیسو کے بیان میں ہی وہ نہیں الجھے رہے۔ غم روزگار کا بھی انھوں نے بار بار ذکر کیا ہے غالب کا غم ہمہ گیر ہے۔ وہ جب اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے

ہیں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس عالم سے وہ کبھی نہیں گزرے، ہماری واردات قلب بھی یہی ہے۔ وہ غم روزگار کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس سے بیزار نہیں ہوتے۔ غم کھانے میں ان کو لطف آتا ہے۔ اور انسان کی زندگی کا ضروری جزو غم کو سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

بقول رشید احمد صدیقی صاحب "غالب کی شخصیت و اہمیت کا تصور کرتے وقت ہمیں یہ بات نظر انداز کرنی نہیں چاہئے کہ غالب نے کسی حال میں بھی سوا اپنے کسی اور کی آڑ نہیں پکڑی۔ دنیاوی مشکلات سے وہ کہیں بھاگتے چھپتے نہیں پھرے، ہر طرح کے مصائب کا مقابلہ کیا اور ہر سماوی کے رنج سے بپھٹے حال لیکن مسکراتے نکلے، اور اپنے کو غم روزگار کا طفل مکتب بجان کر یہ کہہ کے دل کو تسلی دے لی ؎

لیتا ہوں، مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

غالب دراصل غم روزگار سے الجھنے کے لیے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ضمیر میں نشاط کی سرمستیاں تھیں۔ لیکن ان کی محرومیوں نے آخر غم ہستی کے خارزار تک ان کو پہنچا کر دم لیا اور رفتہ رفتہ مرزا کا ساز سوز میں اور قہقہے آہوں میں بدل گئے۔ ان کی حرماں نصیبی خاکستری تہ میں چنگاری کی شکل دبی ہوئی ہے وہ اپنی محرومیوں کو اور معاصر شعرا کی طرح صاف صاف پیش نہیں کرتے، بلکہ بیدل کی اور ظہوری کی طرز میں نالہ کش ہوتے ہیں ؎

ہیں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا!

غالب کے یہاں افسردگی و پامالی کی آتی حسرت سنجیاں ہیں اور ان پر انھوں نے اتنے مختلف انداز میں طنز آمیز آہ کی ہے۔ ان کی شوخ فطرت کچھ دب کر رہ گئی ہے۔ اور یہ شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں وہ قنوطی تو نہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ فطری طور پر مرزا غالب کے مزاج میں عیش ساماں شوخی و انبساط تھا۔ لیکن طرز تپاک اہل دنیا اور قحط غم الفت نے ان کی رگ جان کے قریب ایسا نشتر غم رکھ دیا کہ وہ تڑپ اٹھے ؎

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غالب کے یہاں صرف آہ نہیں، آہ کے ساتھ ایک پائدار کراہ بھی ہے۔ بعض اوقات، وہ صرف شاعر نہیں بلکہ ایک دیدہ ور فلاسفر کے بھیس میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ؎

حنائے پائے خزاں ہے بہار گر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے، عیش دنیا کا

اس شعر میں وہ تیور و شوخ بہار سے بہت قریب ہیں۔ بہار کو اگر حنائے پائے خزاں سے تعبیر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح حنا کا رنگ چند روزہ ہے اسی طرح بہار کی نکہت اور چمن کے نکھار کو بھی دوام حاصل نہیں، یہی حال دنیاوی عیش و طرب کا ہے، عیش کی مدت چند روزہ ہے اور یہ اپنے بعد کلفت دوام چھوڑ جاتی ہے۔ اس لئے انھوں نے پوری نہ ہونے والی آرزوؤں کو لیکر اس دنیا سے دور الگ تھلگ رہ کر خموشی کی زندگی گزارنے کا تہیہ کر لیا ؎

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

مگر اس عالم میں بھی غم جاناں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ تو انھوں نے اپنے بیقرار دل کی تسلی کے لئے کہا ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

آخر زمانے نے ان پر اتنے ستم توڑے کہ وہ غم سے بالکل بے نیاز ہو گئے۔ اور ان کو مرنے جینے کا بھی فکر نہیں رہا ؎

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

لیکن اس قدر مبتلائے آلام رہنے کے بعد بھی اپنی محبوبہ سے مرزا کا پیمان الفت استوار رہا اور اس سے انھوں نے والہانہ انداز میں کہا ؎

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

غم دوراں کے ہاتھوں تنگ آکر مرزا غالب کو سفر کرنا پڑا اور سفر میں جب ان کو وطن یاد آیا تو یاران وطن کی کج ادائیاں بھی یاد آگئیں اور انھوں نے اپنے پر طنز کی ؎

تھی، وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

مگر غریب الوطنی میں بھی اپنی محبوبۂ گل اندام کو غالب نہ بھلا سکے اور اس کو انھوں نے نامۂ شوق میں لکھا ؎

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اور جب مرزا غالب کے خط کے جواب میں محبوبہ وفا شعار نے اپنی محبت کا یقین دلایا تو انھوں نے حسرت آمیز انداز سے یہ شعر کہا ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

آخر مسلسل ناکامیوں کی بدولت وہ مناظر فطرت سے بھی اکتا گئے گل و گلشن کی سیر سے بھی بیزار ہو گئے ؎

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

دنیا کے اور لوگوں کو شاد و خرم دیکھ کر مرزا غالب نے مشکرانہ پیرایہ میں کہا

؎ جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

آخر مصائب کی یورش سے گھبرا کر مرزا صاحب اس جہان رنگ و بو سے بالکل اکتا گئے، زمین و آسمان ان کو اپنے دشمن نظر آنے لگے۔

؎ مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

مسلسل افکار میں مبتلا رہنے کے بعد گھبرا کر انھوں نے اپنی محبوبہ سے بھی ایک مرتبہ کہہ دیا ؎

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

اور پیہم مصائب میں مبتلا رہنے کے باعث آخر ان کو کہنا ہی پڑا ؎

رنج طاقت سے سوا ہو تو اٹھائیں کیونکر
ذہن میں خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی

اور شب و روز غم کھاتے کھاتے بہت گھبرا گئے تو خدا سے بھی شکوہ کر بیٹھے۔

؎ زندگی اپنی جب اس رنگ سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

عالم شباب کی سرمستیوں ختم ہونے کے بعد ان رنگ رلیوں اور بزم آرائیوں کی یاد میں کہا ؎

یاد تھیں، ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

دنیا کے دکھوں سے تنگ آ کر پھر اپنے بخت نارسا کو انھوں نے کوسا ؎

؎ جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

پھر اپنے حسرت نصیب دل کو یہ کہہ کر تسلی دی ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مرزا غالب بھی آخر انسان تھے مسلسل آلام کے چکر سے گھبرا کر چیخ اٹھے ؎

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

غرض انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ دنیا دکھوں کا جہان ہے اور افکار تو جان کے ساتھ ہیں ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم زندگی کے بوجھ تلے دب کر وہ پھر کراہے۔

؎ غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

آخر ان کی عمر کا وہ عبرت ناک دور بھی آگیا جب ان کو غم دوراں کے ہاتھوں غم جاناں کو چھوڑنا پڑا اور کاروبار شوق کو انھوں نے بالکل ترک ترک کر دیا ؎

فرصت کاروبار شوق کسے
ذوق نظارۂ جمال کہاں
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

پھر غموں کی تہمات سے عاجز آ کر عالم بیچارگی میں انھوں نے خدا سے فریاد کی ؎

مری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

اور آخر اس فریب کار دنیا اور دنیا والوں، یہاں کے ساز و سامان سب کو چھوڑ دینے کا عزم مصمم کر لیا ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

غرض کہ غالب کے درد و آلام کی کہانی بھی فن کارانہ محاکات سے سجی ہوئی ہے۔ اور ان کی شاعری "ادب برائے ادب" نہیں بلکہ شعر کے آبگینے میں انھوں نے جھلکے زندگی کو ایسی سادگی و پرکاری سے پیش کیا ہے کہ ان کے اس کمال کے سامنے ارباب علم و فن سر جھکا دینے کے لئے مجبور ہیں۔

نئی کتابیں

شیخ نیازی

مصنف پروفیسر رشید احمد صدیقی۔
ناشر، سر سید بک ڈپو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

بچوں کے لئے مزاحیہ مضامین کے اس مجموعے کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ پروفیسر صدیقی کے مزاحیہ مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے قلم کی روانی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بہت بڑی بڑی باتوں کو بھی لپیٹ لیتی ہے بچوں کے لئے ان مضامین میں انھوں نے کہیں کہیں ایسے اخلاقی، سماجی نفسیاتی اور فلسفیانہ مسائل کے چھوٹے چھوٹے دریچے کھول دیئے ہیں کہ "شیخ نیازی" کی یہ روداد بڑے عمر کے لوگوں کے لئے بھی دلچسپ اور دل آویز ہوگی۔ ہمارے ملک میں ایک مزاحیہ نگار کی حیثیت سے قابل مصنف کی شہرت زیادہ تر ان کی اسی خصوصیت پر مبنی ہے کہ ان کے خیالات میں روانی بے پناہ ہے اور جب قلم رواں ہوتا ہے تو راستے میں جو کچھ سامنے آگیا اس پر چوٹ

کرتا ہی چلا جاتا ہے۔

"شیخ نیازی" کی داستان میں ان کا انداز نگارش ایسا ہلکا پھلکا رہا ہے اور زبان اتنی آسان ہے کہ ہر عمر کے بچے اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اور ہزار ہا بڑوں کو بھی "شیخ نیازی" کی داستان میں اپنے بچپن کا عکس نظر آئے گا! ــــ بعض مقامات پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا صدیقی صاحب خود اپنے بچپن کا حال لکھ رہے ہیں!!

مختصر یہ کہ بچوں کے لئے مزاحیہ لٹریچر کا اس سے بہتر نمونہ اردو زبان میں نہیں مل سکتا۔

عروس نیل

ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی
قیمت دو روپے آٹھ آنے

عروس نیل سلطانہ آصف فیضی اہلیہ سفیر ہند متعینہ مصر کے زمانہ قیام ۱۹۵۱ء کے گہرے تاثرات کا دلاویز مجموعہ ہے جو بعض تصاویر سے بھی آراستہ ہے۔ کتاب کے شاعرانہ نام کے ساتھ ساتھ مصنفہ کا انداز بیان بھی شاعرانہ اور کافی رنگین ہے جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی کتاب کے شروع سے آخر تک باقی رہتی ہے۔

عروس نیل ایک عنوان ہے اور یہی عنوان کتاب کے نام بھی ہے۔ اسی عنوان کے تحت مصر کے قدیم رسم و رواج کا حال بیان کیا گیا ہے اور اسی طرح دوسرے عنوانات سے بھی جو مضامین لکھے گئے ہیں، ان کے متعلقات کی تشریح کی گئی ہے۔

موجودہ مصر کے مسائل ہر چند کہ بڑی حد تک ہمارے مسائل سے ملتے جلتے ہیں پھر بھی مصنفہ کے قلم نے وہاں کی زندگی کے سیاسی مسائل سے مکمل احتراس کیا ہے اور کتاب کا موضوع چونکہ سفر نامہ نہیں ہے۔ اس لئے بیان میں جو افراط تفریط ہے وہ قابل معافی ہے۔

"تماشا" (پندرہ روزہ)

حیدرآباد کے ممتاز مزاحیہ نگار مرزا حصمت اللہ بیگ مرحوم نے یہ اخبار چند برس ہوئے جاری کیا تھا۔ پیش نظر اس کا تیسرا شمارہ ہے۔

مرزا صاحب کے مزاح کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ابتذال اور اذیت سے بہت دور رہتا تھا۔ "تماشا" کے تیسرے شمارے کی نظم و نثر میں بھی یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اس رنگ اور اس معیار کا کوئی دوسرا اخبار یا رسالہ موجود نہیں اور "تماشا" اردو ادب کی ایک کمی کو پورا کر رہا ہے۔

مرزا صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد یہ رسالہ اصحاب ذوق کی پوری تائید کا مستحق ہے۔ قیمت سالانہ ۶ روپیہ ہے۔

مقام اشاعت :- دفتر تماشا - مکان نمبر ۲۹۹ ہاشم جاہی روڈ، کاچی گوڑہ حیدرآباد۔ دکن،

اخبار بھارت جیوتی کا تبصرہ

باپو کے قدموں میں

(ترجمہ قاضی عبدالغفار
ناشر :- انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔
قیمت :- ہر سہ حصہ پندرہ روپے)

ہندوستان کی جمہوریہ کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام ادبی دنیا میں بہت کافی مشہور ہے۔ انھوں نے نہ صرف نظم و نثر اور تدبیر کے میدان بلکہ تحریر اور تقریر کے میدان میں بھی بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

"باپو کے قدموں میں" ڈاکٹر راجندر پرشاد نے گاندھی جی کے ساتھ اپنی سیاسی زندگی کا حال بہت بصیرت افروز طریقہ پر لکھا ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی راج کے خلاف جاری جدوجہد کی یہ ایک مختصر تاریخ ہے۔

قاضی عبدالغفار ایک ممتاز اہل قلم ہیں۔ جنھوں نے اس کتاب کا سادہ اور شائستہ اردو میں ترجمہ کر کے اردو ادب کے ذخیرے میں بہت اچھا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں شائع کی گئی ہے اور اس کی طباعت بہت عمدہ ہے۔ کتاب اس قابل ہے کہ ہر طرف اس کا خیر مقدم کیا جائے اور اس کو ہر اچھے کتب خانہ میں جگہ ملے۔

مرقع افغان

تالیف :- مولانا ابرار حسین فاروقی
ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ قیمت ۳/۱۲ روپے

مرقع افغان ہندوستان میں خاندان لودھی کے متعلق ایک تاریخی اور تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ کتاب زیادہ تر عبداللہ کی "تاریخ داؤدی" پر مبنی ہے جو شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ مولانا ابرار حسین فاروقی نے خاندان لودھی، ان کے طرز حکومت طریقہ بود و باش اور عوام کے ساتھ انصاف کرنے کے طریقوں کے متعلق سچے واقعات پیش کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لئے بہت مددگار ثابت ہوگی جو تاریخی مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

پرنٹر و پبلشر قاضی عبدالغفار نے نیشنل پرنٹرس کمپنی میں چھپوا کر مرکزی دفتر علی گڑھ سے شائع کیا۔